R. No. 2186/57 | Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Phone—29
Annual Rs. 4/-
per Copy-12

Date
1-8-15-22

جلد ۲۶ - شمارہ ۴۱ | ایڈیٹر آل احمد سرور | یکم نومبر ۱۹۶۷ء

اداریہ

اردو میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مسائل

اگرچہ ابھی تک تمام ریاستوں میں اردو میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام تسلی بخش نہیں ہے مگر بہرحال کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے گو اردو ذریعے میں ثانوی تعلیم کی منزل پر کچھ نہیں ہوا۔ چونکہ اب تمام جدید ہندوستانی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ بھی سامنے آگیا ہے اور اس سلسلے میں بھی غور و فکر ہو رہا ہے، اس لیے ہمارا پہلا فرض اب یہ ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی منزل پر جہاں جہاں خامیاں ہوں ان کو دور کیا جائے۔ اس سلسلے میں انجمن کی شاخوں کو خصوصاً اور اردو دوستوں کو عموماً سب سے پہلے اعداد و شمار فراہم کرنے چاہئیں۔ مرکزی انجمن کی طرف سے ایک گشتی عنقریب جاری ہوگی جس میں ریاستی شاخوں سے دریافت کیا جائے گا کہ ان کی ریاست میں کتنے ابتدائی اسکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم ہے اور ایسے ثانوی اسکول کتنے ہیں جن میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے یا اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ یہ اعداد و شمار ریاستی شاخیں اپنی مقامی شاخوں یا اپنے خاص نمائندوں کے ذریعے سے جمع کر سکتی ہیں۔ اسکولوں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ ان میں کون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور ان کا معیار کس حد تک قابل اطمینان ہے۔ نیز یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ اساتذہ کی تعداد کتنی ہے اور وہ تربیت یافتہ ہیں یا نہیں اور ضرورت کے مطابق ان کی تعداد ہے یا کم ہے۔ اس سلسلے میں تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد یہ فیصلہ ہو سکے گا کہ کس ریاست میں کس قسم کے قدم اٹھانے ہیں۔ سرکاری ذرائع سے بھی یہ معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں لیکن جب ریاستی حکومتیں لسانی اقلیتوں کے کمشنر کو معلومات فراہم کرنے میں دیر کرتی ہیں، وہ ہمیں تو برسوں ٹالتی رہیں گی پھر ہم یہ بھی ایمانداری سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ معلومات ہر طرح سے صحیح ہوں گی۔ اس لیے ہمیں یہ کام خود کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی ہر ریاست میں ایک پروگرام کے تحت ابتدائی اور ثانوی منزل پر تعلیم کی سہولت، کتابوں کی فراہمی، اساتذہ کی تربیت اور ان کے تقرر کے لیے موثر کوشش ہو سکتی ہے۔ اس منزل پر یہ بھی فیصلہ ہو سکتا ہے کہ مقامی وسائل کو دیکھتے ہوئے کہاں کہاں انجمن کی شاخیں یا دوسرے اردو کے ادارے اپنے اسکول کھول سکتے ہیں۔

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ حکومت کو توجہ دلانا اور حکومت سے ہر منزل پر اردو میں تعلیم کا مناسب انتظام کرانا اس لیے ضروری ہے کہ اوّل تو یہ ہمارا حق ہے اور ہم کو اس حق کے حاصل کرنے کے لیے پرامن اور جمہوری قدم اٹھانا ہے، دوسرے، حکومت کا بھی یہ فرض ہے اور اسے اس کا فرض برابر یاد دلاتے رہنا چاہیے، مگر یہ بات بھی اردو دوستوں کو گرہ میں باندھ لینا چاہیے کہ صرف حکومت سے مطالبہ کرنے سے کام نہ چلے گا۔ ہمیں اس کے ساتھ اپنے طور پر بہت کچھ کرنا ہوگا، بلکہ ہم اپنے طور پر کچھ کریں گے تو حکومت سے بھی بہت کچھ کرا سکیں گے۔ عمل کرانے کے لیے خود عملی صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ اس لیے اپنی ساری طاقت حکومت سے مطالبے پر صرف نہیں کرنی چاہیے، اس کا نصف حصہ اپنے طور پر کچھ کرنے کے لیے رکھنا چاہیے۔ اپنے طور پر کچھ کرنے سے پہلے وہ تمام اعداد و شمار فراہم کرنا لازمی ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا۔

اردو دوست اب تک جلسوں، جلوسوں، احتجاجی اقدامات، کانفرنسوں کی چمک دمک سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ تعمیری کاموں میں جو ریاض کرنا پڑتا ہے، جو خون جگر صرف کرنا ہوتا ہے، جو پتہ مارنا پڑتا ہے، اس کی افادیت پر ابھی ان کی نظر نہیں گئی۔ ہمیں اپنے اوپر یہ ضبط و نظم عاید کرنا ہے۔ اس کے لیے اپنے اوپر، اپنی زبان پر، جمہوریت پر اور ملک و قوم پر اعتماد کی ضرورت ہے۔ گو اب تک جمہوریت نے اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا، مگر یہ خرابی جمہوریت کی نہیں، ان لوگوں کی ہے جنھوں نے جمہوریت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ ہمیں اس سستی سیاست اور اس دہشت پسندی کو جو آج ملک کی ترقی کی راہ میں روڑا بنی ہوئی ہے، دور کرنا ہے اور سچی جمہوریت کو لانا ہے۔ اس کے لیے عقیدے اور عمل دونوں کی ضرورت ہے، اور عقیدے اور عمل کے لیے دوسروں پر اعتراض کرنے میں اپنی قوت

صرف کرنے کے بجائے، جو کچھ ہم کرسکتے ہیں اس پر پورا زور دینے کی ضرورت ہے۔ اس لیے اپنے اس تعمیری پروگرام کو جس کا تعلق ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی منزل پر تسلی بخش انتظامات سے ہے فوراً شروع کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کا سوال ہو گا جس کے لیے سوچ بچار ابھی سے کرنا ہے تاکہ ابھی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی بنیادوں پہ مناسب اور موزوں اعلیٰ تعلیم دی جاسکے۔ اس کے مسائل پر علیحدہ بحث ہوگی۔

لکھنؤ میں غالب کی صد سالہ سالگرہ کا پروگرام

لکھنؤ: غالب کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات یو پی میں آئندہ ۱۵ فروری سے شروع ہوں گی۔ یہ فیصلہ غالب کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات سے متعلق کمیٹی نے آج ودھان بھون میں اپنی ایک نشست میں کیا۔

کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین سے درخواست کی جائے کہ وہ لکھنؤ میں آئندہ ۱۵ فروری کو تقریبات کا افتتاح کریں۔

یو پی کے گورنر ڈاکٹر بی گوپال ریڈی نے جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ غالب کے منتخب کلام کو ہندی اور دیگر زبانوں میں بھی شائع کیا جائے۔ غالب کے کلام کے گراموفون ریکارڈ بھی تیار کیے جائیں اور انھیں سستے داموں پر فروخت کرنے کا انتظام کیا جائے۔

شری اے جی سین نے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ اس موقع پر ہندی اور اردو کے پرستاروں کو مل جل کر کام کرنا چاہیے تاکہ قومی یکجہتی کے کام میں تقویت مل سکے۔

کمیٹی کے کنوینر جناب بی۔ این سیٹھی نے کہا مرزا غالب کے اعزاز میں ایک تحقیقی ادارہ قائم کرنے کی بھی تجویز ہے۔ کمیٹی کا ارادہ ہے کہ مرزا غالب کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر ہندی اور اردو میں سیمینار منعقد کیے جائیں۔ کمیٹی کی تجویز ہے کہ مرزا غالب کے کلام کو ہندی اور دیگر زبانوں میں سستے داموں پر فراہم کیا جائے۔ کمیٹی نے طے کیا کہ حکومت ہند سے درخواست کی جائے کہ ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو غالب کی شبیہ کے ۱۵ پیسے کے ٹکٹ جاری کرنے کا انتظام کیا جائے۔

پنڈت آنند نرائن ملا، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، جناب مقبول احمد لاری اور جناب خیر بہوروی نے اس سلسلہ میں متعدد تجاویز پیش کیں۔ کمیٹی کی جانب سے گورنر صاحب کو غالب کی ایک نادر تصویر اور غالب جیز اول پیش کی گئی۔ یہ طے کیا گیا کہ کمیٹی کی آئندہ میٹنگ ۱۱ نومبر کو منعقد کی جائے جس میں تقریبات کے پروگرام کو عملی شکل دی جائے۔

(قومی آواز لکھنؤ)

آسٹریس کو ادب کا نوبل پرائز

اسٹاک ہالم: گوئٹے مالا کے مصنف انجیل آسٹریس کو ۱۹۶۷ء کا ادب کا نوبل پرائز ان کی انتہائی رنگین تصنیف پر دیا گیا جس میں ان کی قومی انفرادیت اور "انڈین" روایات بہت نمایاں ہیں۔

جناب آسٹریس ۶۸ برس کے ہیں اور آج کل پیرس میں گوئٹے مالا کے سفیر ہیں۔ ان کی سالگرہ کے موقع پر یہ اعلان کیا گیا۔

۶۸ سالہ مصنف لاطینی امریکہ کے "ریڈ انڈین" کے ترجمان ہیں۔ ان کو ۶۲ ہزار ڈالر ملیں گے۔ جناب آسٹریس ۱۸۹۹ء میں گوئٹے مالا میں پیدا ہوئے۔

جناب آسٹریس ہمیشہ عسکری نظام کے خلاف لکھتے رہے اور انھوں نے جنوبی امریکہ کی اصلی آبادی (ریڈ انڈین) کے کچلے جانے کے خلاف ہمیشہ اپنی آواز بلند کی۔ اس سلسلے میں کئی سال تک انھیں ارجنٹائن، اٹلی اور فرانس میں جلا وطنی کی زندگی گزارنا پڑی۔

پیرس کی سوربون یونیورسٹی میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنے ملک کی حکومت بدلنے کے بعد انھیں یہاں کا سفیر مقرر کر دیا گیا۔

(قومی آواز)

پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں اردو کلاسز

اردو اور ہندی کے افسانہ نگار اور ناول نویس اور پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے شعبۂ تاریخ کے ریڈر ڈاکٹر ستیہ پرکاش سنگر نے گزشتہ سال کی طرح امسال بھی یونیورسٹی ہسٹری ڈیپارٹمنٹ میں اردو کی فری کلاسز شروع کی ہیں۔

ایشیائی زبانوں کو جدید ترین بنانے کے اقدامات

نئی دہلی: مستشرقین کی دوسری عالمی کانفرنس ہے جس کے اجلاس حال ہی میں کوالالمپور میں پایۂ اختتام کو پہنچے ہیں ایشیائی اقوام کی زبانوں کو جدید ترین بنانے کے وسائل پر گفتگو ہوئی۔ اس کانفرنس نے یونیسکو پر اس بات کے لیے زور دیا کہ ایشیا کے مختلف ملکوں کی زبانوں اور ادب کے درمیان قریبی رابطے کے لیے ایک ثقافتی مرکز کھولا جائے۔ یونیسکو سے سفارش کی گئی ہے کہ وہ ایشیائی مصنفین کی سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ سے متعلق کتابوں کا ایک بینک کھولے۔ ادارہ مذکور کو یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ وہ رومن رسم الخط میں ایشیائی اصطلاحات السانی ڈکشنری بھی چھاپے۔ ان سفارشات سے متعلق تجاویز بھارتی مندوب ڈاکٹر گوپال شرما نے جن کا تعلق وزارت تعلیم کے سنٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ سے ہے پیش کیں جو کانفرنس مذکور میں اتفاق رائے سے پاس ہو گئیں۔

(قومی آواز)

انیس الدین

'مکتوب لندن'

بزم تفریح لندن کی ماہانہ محفل

لندن ۲۲ اکتوبر۔ جناب عبدالعلیم صدیقی سکریٹری 'بزم تفریح' لندن کی اطلاع کے مطابق ماہانہ محفل مشاعرہ و موسیقی ۱۶ اکتوبر شام ہیبے الائنس ہال میں منعقد ہوگی۔ صدارت چودھری اکبر خاں صاحب فرمائیں گے۔ پروگرام حسب ذیل ہوگا۔

۶ تا ۶ ½ چائے و تعارف۔ ۶ ½ بجے سے ۸ بجے تک مشاعرہ اور ۸ بجے سے ۹ بجے تک گیت اور قوالی وغیرہ۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات سے پابندی وقت کی درخواست کی گئی ہے۔

ساؤتھ آل میں مشاعرہ اور ورائٹی پروگرام

لندن ۱۳ اکتوبر۔ جناب ایم۔ اے۔ چودھری کی اطلاع کے مطابق گذشتہ ہفتہ انڈو پاک لٹریری اینڈ آرٹ سرکل کے زیر اہتمام ساؤتھ آل میں ایک دلچسپ تقریب کا انعقاد ہوا۔ جس میں مشاعرہ اور تفریحی پروگرام کا اہتمام کیا گیا تھا۔

ماہنامہ 'آفاق' نوٹنگھم

لندن ۱۰ اکتوبر۔ ستمبر کے 'آفاق' میں عصمت چغتائی کا افسانہ 'دلچسپ'، حفیظ جالندھری کی نظم 'ہمیں یاد ہے آج تک وہ زمانہ'، عبدالرحمن صدیقی کا افسانہ 'نامرد'، حیش ناصری کی غزل، قتیل شفائی کی نظم 'مجھے پیار اپنے وطن سے ہے'، منصور تیمر کا افسانہ 'پھول پھر کھلیں گے'، مشہور زمانہ نجم و ہیئت داں میر بشیر کی نظم 'یہ کائنات عظیم'، عندلیب شادانی کی نظم 'میری جناب'، کلیم احمد شجاع اور جمیل ملک کی غزلیں، اکرم ضیاس کا افسانہ 'بیماری کا'، فرحت شاہجہاں پوری کا مضمون بعنوان 'آغا حشر ایک وطن پرست ڈرامہ نویس اور قومی شاعر تھے' اور راجہ مہدی علی خاں مرحوم کی مشہور نظم 'ہیرو' کا پہلا اشردیو کی شمولیت اس شمارہ کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے۔

یہ کائنات عظیم؟ — از میر بشیر لندن

یہ کائنات یہ عکس مہ و جمال نجوم
یہ جلوہ گاہ تحیر یہ بے قرار ہجوم
مراغ گردش اوّل ہی اک سوال قدیم
یہ انقلاب مسلسل کی انتہا معلوم
یہ سوچتا ہوں کہ اس کا نفاذ کیا معنی
یہ نظم و ضبط کہ جس پہ ہے زندگی محکوم
خدائے عقل و خرد یہ خلائے لامحدود
یہ آرتعاش لطیف یہ رموز شکار نجوم

یہ کیوں ہے کیا ہے یہ سیلاب بیکران عظیم
کہ عمر رواں ہے یہ مجبور کاروان عظیم

ہفت روزہ 'مشرق' لندن

لندن ۳۰ اکتوبر کے شمارہ میں ابن انشاء کے مضمون 'لندن دیکھا لندن والے دیکھے' کا جستہ جستہ انتخاب۔

'لندن میں کیا دیکھا اور پہلے کی نسبت کیا فرق پایا۔ ہاشمی جی (محمود ہاشمی، مدیر مشرق) یہ آپ کیا پوچھتے ہیں۔ کچھ فرق لندن میں پڑا ہوگا کچھ ان چھ سال میں ہم میں پڑا ہوگا۔ ایک زمانہ میں جو باتیں بے ضرر خوش فعلیاں معلوم ہوتی ہیں چند سال کے بعد ناشائستہ حرکات بلکہ قرب قیامت کی نشانیاں قرار پاتی ہیں سہ

ان کا شعلہ کی یادیں اب کسالو دل کہتے ہیں ہم جب جگر ودشت وفا تھے سارا دشت غزالاں تھا

(یہ میرا شعر ہے کسی استاد کا نہیں)۔ .... ہم نے کراچی سے لکھا تھا کہ ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست برٹش میوزیم کے آس پاس کیا جائے۔ یوں تو لوگوں کے نزدیک ہم میوزیم کے اندر رکھنے کی چیز ہیں۔ ...... سائنس میوزیم میں ہزار برس کے بعض چرخے اور کلیں تو ایسی نظر آئیں کہ ہمارے ہاں آج تک ایجاد نہیں ہوئیں۔ پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق۔ .... آپ پوچھتے ہیں کہ ہپی HIPPIES دیکھے؟ جی ہاں دیکھے۔ پہلے بھی تھے لیکن کم یہ جگہ تو ہپیوں کا ہر دوار معلوم ہوتی ہے (ہردوار کا استعمال مہارشی مہیش یوگی کی رعایت سے خوب ہے۔ مہیش یوگی نے FLOWER PEOPLE اور BEATLES اور HIPPIES کے استاد کی حیثیت سے یہاں خوب نام پیدا کیا اور حال ہی میں ہندوستان واپس گئے) ان لوگوں کی الجھی الجھی داڑھیاں دیکھ کر تو اب بھلے مانس داڑھی رکھتے ہوئے شرماتے ہیں کہ کہیں ان میں ہمارا شمار نہ ہو .... پاکستانی بھارتی اب بھی بہت ہیں لیکن ہمارے مشاہدہ میں کم از کم لندن میں افریقیوں کی تعداد ان سے زیادہ نظر آئی۔ ہاشمی جی آنے والا زمانہ کالوں کا ہے۔ جانے والا زمانہ گوروں کا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم کالے اب اپنے کالے ہونے کو اچھے نصیبہ کی دلیل سمجھیں۔

طیب انصاری

دورِ آصفی کے اردو رسائل

ماہنامہ معلم نسواں

حیدرآباد میں اردو کے ادبی رسائل و اخبارات کی تاریخ ایک صدی پرانی ہے یا پھر اس کا جنم ابھی پچیس برس ہی پچھلی صدی کو ہوا لیکن اس کم مدت میں ادبی رسائل و اخبارات کا جو رول رہا ہے وہ تاریخ ادب اردو میں آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے یہ اخبارات اور رسائل بہت جلد ہمہ گیر شہرت کے مالک بن گئے اور ان کے لکھنے والوں میں بیک وقت حیدرآباد اور لکھنؤ کے ادبا و شعرا شامل تھے۔ اس کے علاوہ شمال کے چند دوسرے لکھنے والوں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ حیدرآباد کے صحافتی معیار کو بلند کرنے میں یقیناً ان اخبارات و رسائل کے ایڈیٹروں کا بڑا ہاتھ رہا ہے جن لوگوں نے حیدرآباد میں اردو صحافت کو پچھلے برسوں نیا رنگ روپ دیا اور نئی تبدیلیاں لائے۔ ان میں محب حسین کا نام سرفہرست ہے۔ جدید صحافت کے اس "معمار اولین" نے نہ صرف صحافت کے معیار ہی کو بلند نہیں کیا۔ ظاہری اعتبار سے اور معنوی لحاظ سے بھی فکر و عمل کے چراغ روشن کیے اور اس وجہ سے "دکن کا پیچری" اپنے عہد کا بانی کہلایا۔ محترمہ زینت ساجدہ نے محب حسین کی صحافتی اور سماجی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"تجدد اور اجتہاد کی جو شعل محب حسین کے ہاتھ میں تھی وہ شرار افغانی کا ایک کرشمہ تھی۔ مولانا جمال الدین افغانی کے قیام کے زمانے میں انھیں کے مشورے سے انھوں نے صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور پہلے معلم شفیق (۱۸۸۰ء) پھر معلم نسواں (۱۸۹۲ء) اور روزنامہ "علم و عمل" (۱۹۱۴ء) جاری کیا۔

محب حسین کانگریس کے حامی، ایک قومی نظر کے طرفدار، محنت کش طبقات کے ترجمان، حقوق نسواں کے محافظ، صحافتی آزادی کے علمبردار اور سماجی اصلاح کے مبلغ تھے"[1]

سچ تو یہ ہے کہ محب حسین کی شخصیت بڑی ہمہ مقصدی اور پہلودار تھی، انھوں نے اپنی زندگی کے مقصد کا تعین کرلیا تھا اور وہ مقصد اصلاح معاشرہ تھا۔ مسلم معاشرہ کی تن آسانی انھیں بھی خون کے آنسو رلاتی تھی۔ وہ درد مسلم ان کے سینے میں بھی ہوک کی صورت میں ابھرتا رہا ہے جس کی کسک راتوں کی نیند اچٹ جاتی ہے اور دن کا آرام جس سے حرام ہوتا ہے۔ محب حسین بلاشبہ صحافی بھی تھے اور ادیب بھی۔ ان کی شاعری اور ان کے خطوط اس بات کا ثبوت ہیں کہ انھوں نے ہر میدان میں معاشرہ کی اصلاح کی کوشش کی۔ محب حسین "بانی حقوق نسواں" کے نام سے بدنام ہوئے لیکن ان کی ساری کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بڑی سنجیدگی رکھتی ہے کہ محب حسین نے حقوق نسواں کے لیے جو کوشش کی ہے اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ وہ اپنے مقصد میں پورے اترتے اور وہ مقصد اصلاح و معاشرہ ہی تھا۔ محب حسین نے آزادی نسواں کی تحریک چلائی۔ گو یہ آواز حیدرآبادی تہذیب اور جاگیرشاہی کے منافی تھی اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آزادی نسواں کے تصور کا جو غلط مفہوم عام ہوا اس سے معاشرہ مدبہ اصلاح تو کیا ہوتا اور زیادہ آلودۂ عصیاں ہوگیا۔

لیکن اس غلط تصور کی تردید کے ساتھ ساتھ فکر صحیح کو عام کرنا اور عورت کو جہالت سے نجات دلا کر علم و خیال کی روشنی سے ہمکنار کرنا بھی ضروری تھا۔ محب حسین نے آزادی نسواں کی تحریک کو اپنی شاعری اور انشاپردازی کے ذریعہ ہی نہیں رسائل کے ذریعہ بھی عام کیا۔ چنانچہ روزنامہ "علم و عمل" ہو یا "معلم شفیق" "معلم نسواں" ہو یا پھر "افسر" دیوان محب ہو کہ خطوط محب سبھی جگہ آپ ایک ہی آواز اور ایک ہی آہنگ پائیں گے۔ اس سے محب حسین کی اپنے مقصد سے مخلصانہ وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ محب حسین نے "معلم شفیق" اور پھر ماہنامہ "معلم نسواں" کے ذریعہ سماج کی پرانی رسموں پر کاری ضرب لگائی ہے۔ نئی قدروں اور نئے رجحانات کو عام کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی سلسلہ میں انھیں مختلف دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ محب حسین مخالفتوں کا مقابلہ کرتے کرتے بالآخر زمانہ پیری میں قدم رکھتے ہیں۔ قوائے جسمانی جواب دیتے ہیں اور جب مقابلہ کی تاب باقی نہیں رہتی تڑپ کر رہ جاتے ہیں لیکن دھن میں اور مقصد میں تبدیلی نام کو نہیں آتی۔ ماہنامہ "معلم نسواں" ان ہی وجوہات کی بنا پر بند ہوا چنانچہ آخری شمارہ میں لکھتے ہیں:۔

"معلم نسواں نے ملک کی خدمت میں برس کی اور اس میں سے نو برس خاص عورتوں کی آزادی کی نسبت جان توڑ کوشش کی۔ آخر ہماری قوم کے بعض ناسمجھ اشخاص نے ہمارے منہ میں لوہے کا قفل ڈلوا دیا اور ہمارا حلق بند کرا دیا۔ ہم ان کے اس ظلم کی نسبت بجز خدا کے اور کسی سے فریاد نہیں کرسکتے۔

اب اگر خدا نے مدد کی تو ہم پہلے اپنی قوم کے تعصب اور جہالت کے مضبوط قلعہ کو توڑنے کی کوشش کریں گے اور عورتوں کی نسبت ان کے دلوں میں جو ایک تاریک خیال ان کے گندے علم و ادب نے صدہا برس کے عرصے میں پیدا کردیے ہیں، انھیں ہم ترجموں، کتابوں اور مستقل رسالوں سے لکھنے اور شائع کرنے سے دور کرنے کی سعی بلیغ کریں گے۔ گو یہ سب ابادے

باقی صفحہ ۶ پر

[1] حیدرآباد کے ادیب، مرتبہ زینت ساجدہ صفحہ ۲۳۰

اسرار اکبرآبادی

دیوالی کی رات

رنگ میں ڈوبے خیالوں سے وہ نکلی ہے کرن
جاگ اٹھی ہیں زندگی کی جھوم کر شہنائیاں
اڑ رہے ہیں لہلہاتے لالہ زاروں پر کنول
آرزوؤں کی ہیں یہ بکھری ہوئی پرچھائیاں
جگمگاتے دائروں میں رقص کرتا ہے چمن
گنگناتے آ رہے ہیں روشنی کے کارواں
راستوں کے حاشیوں سے آ گئے روشن پرے
نرم دھرتی کے بدن کو چومتا ہے آسماں
شوخ ارمانوں کی باہوں میں مچلتا ہے شباب
عشق کو بہلا رہی ہے حسن کی پہلی جھلک
شبنمی یادوں کے پھیلے ہیں گلابی سلسلے
دل دھڑکتے ہیں تو ہوتی ہے فضاؤں میں چمک
جھلملاتے جھومتے جلووں کی وہ نیلم پری
گا رہی ہے مسکرا کر بے خودی کے ساز پر
وہ مچل کر کھل رہے ہیں رنگ نادیدہ گلاب
جام چھلکے جا رہے ہیں نرم سی آواز پر
مست ہو کر زمیوں کو چومتی ہیں مستیاں
وہ ہوا پہ آ رہے ہیں پھول سے کھلتے ہوئے
سرخیوں کی جنبشوں پہ بہہ رہے ہیں خواب سے
دور تک بہکے نظارے ہیں گلے ملتے ہوئے
یہ ملن کی رات، دیوالی کی چنچل شوخیاں
میں اکیلا ہوں ابھی تک آپ آئے کیوں نہیں
پوچھتے ہیں وقت کی لہروں سے یہ جلتے چراغ
آج شاعر نے ہمارے گیت گائے کیوں نہیں

رئیس نعمانی

ایثار

غور سے۔ تم نے
جہاں کو
کبھی دیکھا ہی نہیں
ورنہ
کم مائیگی کا لب پہ۔ گلہ کیوں ہوتا!
یا
تنگ ظرفوں کے ہم دوش
مثالِ شبنم۔ چہرۂ گل سے ہٹاتے نہ نگاہیں اپنی
یا
مری طرح شاد رہتے متاعِ محبوب
اور۔ غریبوں کے دلِ زار پہ مرہم رکھتے

غزلیں

مدحت الاختر

ہر طرح کی خوشی سے خالی ہے　　زندگی حسرتوں کی تھالی ہے
کل جو صیاد تھا بہاروں کا　　آج وہ گلستاں کا مالی ہے
عارضوں کے چراغ جلنے دو　　آج آشاؤں کی دیوالی ہے
کچھ ملے پھول ہو کہ پتھر ہو　　پیار انعام کا سوالی ہے
گل بھی نکلیں گے یا فقط کانٹے　　سوچ میں اب کے ڈالی ڈالی ہے
چھوڑ کر شمع کشتی مدحت
ہم نے سورج سے لو لگا لی ہے

سحر سیتاپوری

تیری تشنہ پہ لطف و کرم عام ہے　　تیری دنیا میں لیکن ستم عام ہے
زخم ہائے گلِ تر نہ سمجھا کوئی　　اور گلشن میں شبنم کا غم عام ہے
میرے حالِ پریشاں پہ مت طنز کر　　گردشِ وقت کا یہ ستم عام ہے
تیری زلفیں بھی برہم ہوں تو کچھ بات ہے　　زندگی کا تو ہر پیچ و خم عام ہے
ٹوٹ جائے نہ پھر شیشۂ دل سحر
آج پھر ان کا لطف و کرم عام ہے

قوی ٹونکی

ہر طرف گلستاں میں حسن ہے اجالا ہے　　ہم نے ہر اندھیرے کو روشنی میں ڈھالا ہے
بے سبب خفا ہونا بے خطا سزا دینا　　آپ کی اداؤں کا رنگ ہی نرالا ہے
کہہ دو اہلِ دنیا سے ہوشیار ہو جائیں　　خونِ آرزو میرا رنگ لانے والا ہے
اہلِ میکدہ کب سے تشنہ لب ہیں اے ساقی　　کیسا میکدہ ہے یہ بادہ ہے نہ پیالا ہے
لذتِ غمِ دوراں کیا ہے؟ پوچھیے ہم سے　　ہم نے غم کے سائے میں زندگی کو پالا ہے
نذر کیا کریں گلچیں، صرف جیب و داماں کا　　قافلہ بہاروں کا، آج آنے والا ہے
اے قوی قیامت سے کم نہیں شبِ فرقت
پھر بھی میرے ہونٹوں پر آہ ہے نہ نالا ہے

زماں انصاری

حوصلہ پست ہے کیوں عشق کی خودداری کا　　یہ کرشمہ تو نہیں حسن کی پرکاری کا
ذہنِ فنکار تو شہکارِ خدا ہے لیکن　　تاج شہکار ہے انساں کی فنکاری کا
لبِ نازک جو ترے کانپ کے رہ جاتے ہیں　　گفتگو میں بھی ہے انداز طرحداری کا
میں تری چشمِ عنایت کا تمنائی ہوں　　مجھ کو احساس ہے احساں کی گرانباری کا
پھر یہ ڈر ہے نہ جھلس جائیں تمنا کے گلاب
پھر گزر دل میں ہوا یاس کی چنگاری کا

خلیل تنویر

قطعہ

نور کے جھرنے پھوٹ پڑے ہیں دیواروں کے شانوں سے
ہولے ہولے جاگ رہی ہے نغموں کی بارات
تیرا آنچل بھیگ نہ جائے روشنیوں کی رات!
نادیدہ آنکھوں نے دی ہے شبنم کی سوغات

خدا کی مرضی پر منحصر ہیں کیونکہ ہم بڑھاپے کے دشمن کو اپنے اوپر مسلط پاتے ہیں اور طاقت بھی روز بروز جواب دیتی جاتی ہے۔ اے ہماری پیاری بہنو! ہم نے تمھاری آزادی، فلاح و بہبودی کے لیے حتی الامکان کوشش تو کی مگر اس کے عمدہ نتائج خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ تم اپنے خیرخواہ معلم نسواں کو کبھی فراموش نہ کرنا۔ بس یہی صلہ ہم تم سے چاہتے ہیں اور اب شاید ہمیشہ کے لیے ہم تم سے رخصت ہوتے ہیں۔ سلام! سلام!! سلام!!!"[1]

اور اس درد انگیز آواز کے معدوم ہوتے ہی "معلم نسواں" بھی بند ہوگیا۔ معلم نسواں کو دکن میں تحریک نسواں کا زبردست بانی اور ترجمان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ بہت کم رسائل ایسے ہوتے ہیں جو زمانے کی تقدیر کو بدلنے میں اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ "معلم نسواں" نے آزادی نسواں کی جو تعلیم دی ہے اس کے مفید نتائج آج ہمیں نظر آرہے ہیں۔ اس وجہ سے معلم نسواں کو حیدرآباد کے چند اہم ترین رسائل میں اولین مقام حاصل ہے۔

"معلم نسواں" ترجمان نسواں ہی نہیں، صحیفۂ نسواں بھی تھا۔ اس میں جہاں عورتوں کی آزادی، ان کی تعلیم و تربیت اور ترقی کے متعلق مضامین شائع ہوا کرتے تھے، وہیں عالم نسواں کی خبریں بھی دلچسپ انداز میں شائع ہوتی تھیں۔ "اخبار نسواں" کے مستقل کالموں میں ان دلچسپ خبروں پر "معلم" کا تبصرہ بھی ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ دو ایک خبریں بطور مثال پیش ہیں۔

"ایک ڈاکٹر کا خیال ہے کہ کسی عورت کے بال تین لاکھ سے زیادہ نہیں ہوتے اور ۲ لاکھ چوبیس ہزار سے کم نہیں ہوتے۔"

"بیان کیا جاتا ہے کہ بہ نسبت معمولی عورتوں کے مجرم عورتوں کے ہاتھ پاؤں بڑے ہوتے ہیں (معلم) یہ ناقص استقراء ہے جو قابل تسلیم نہیں۔"

محب حسین کے دو ناول "سیتا" اور "سوہان روح" معلم نسواں ہی کی دین ہیں۔ "آزاد خیال" کے ڈرامے بھی اسی رسالہ کے ذریعہ منظر عام پر آئے۔ اور اس کے لکھنے والوں میں محب حسین اور آزاد خیال کے علاوہ عزیز مرزا، مولوی محمد مرتضیٰ، عبدالحلیم شرر، منشی احمد حسین، محسن الملک، صادق حسین، اور مولوی عبدالحق کے نام اہم ہیں۔ جہاں تک اس رسالہ کی پالیسی کا تعلق ہے اس پرچہ میں "علوم قدیمہ و جدیدہ یعنی ریاضیات، الٰہیات، صنعت، تجارت، اخلاق، طب، تاریخ، جغرافیہ، ادب، کیمیا اور نباتات پر مضامین ہوتے تھے۔ اور اس بات کی کوشش کی جاتی تھی کہ اخلاق کو مزاح اور تفریح کے ساتھ اور تفریح اور مزاح کو اخلاق کے ساتھ بیان کریں۔ اور ایک پیرائے میں دوسری کو اور دوسری کے پردے میں پہلے کو لکھا کریں گے تاکہ ہمارے ناظرین بقول شخصے کہ ہم خرما و ہم ثواب مسائل علمیہ اور اخلاق حسنہ سے مالا مال ہوتے جاویں اور تفریح اور دل بہلائی بھی اس کے ساتھ ساتھ ہوتی جاوے۔"

معلم نسواں کے اس کامیاب ابتدا نے بہت جلد رسالہ کو مقبول عام بنا دیا۔ اس پرچہ میں غیر مطبوعہ مضامین کے علاوہ منقولہ مضامین اور تراجم بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ محب حسین نے خود کرنل میڈوز ٹیلر کی انگریزی کتاب "سوانح عمری امیر علی ٹھگ" اور "پہلا جرم" ترجمہ کیا۔

"معلم نسواں" میں مختلف کتابوں پر تنقید و تبصرہ بھی ہوا کرتا تھا چنانچہ مولوی عبدالحق نے "صنم خانۂ عشق" منشی امیر احمد کے آخری دیوان پر معلم نسواں میں تبصرہ کیا۔

یہ رسالہ مطبع اسلامیہ چھاؤنی ریذیڈنسی سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کی قیمت فی پرچہ ۱۲ر اور سالانہ ۶ روپے تھی۔

معلم نسواں کو بند ہوئے عرصہ ہوا لیکن حیدرآباد کی صحافت نے آج بھی اس کی روایتوں کو باقی رکھا ہے۔ محب حسین کا انتقال ہوئے کئی برس بیت گئے لیکن جذبۂ خلوص کی کارفرمائی آج بھی جاری ہے۔ حیدرآبادی صحافت اور حیدرآبادی معاشرہ دونوں پر محب حسین کے نقوش عیاں ہیں۔ انھوں نے حیدرآبادی صحافت کو نئی قدروں سے روشناس کرایا اس وجہ سے ہم انھیں بھول نہیں سکتے۔

ماہنامہ افسر

ماہنامہ افسر انیسویں صدی کے حیدرآبادی رسائل میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ نواب افسرالدولہ حیدرآباد کے نوابوں میں خاص مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی ذاتی اور شخصی دلچسپی کی خاطر پہلے پہل محرم ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں قلعۂ گولکنڈہ سے ایک روزنامہ "افسرالاخبار" جاری کیا[1] اور پھر بعد کو صاحب بوستان آصفی کے قول کے مطابق اپریل ۱۸۹۶ء میں ماہنامہ جاری کیا[2]۔ عابد رضا بیدار نے "افسر" پر مضمون لکھتے ہوئے مولوی عبدالحق کے بارے میں لکھا ہے کہ "حیدرآباد پہنچ کر علی گڑھ کے گریجویٹ عبدالحق نے عالی جناب نواب میجر افسرالدولہ بہادر کی سرپرستی میں ۱۸۹۹ء میں افسر کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا جو کم از کم ۱۹۰۱ء کے وسط تک ضرور جاری تھا۔"[3] عابد رضا بیدار نے بغیر تحقیق کیے یہ بات لکھ دی۔ مولوی عبدالحق کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ علی گڑھ سے آنے کے بعد افسر سے وابستہ ہوگئے صحیح ہے لیکن انھوں نے پہلی بار اس رسالہ کو جاری نہیں کیا بلکہ خود افسرالدولہ ماہنامہ کے اجراء سے پہلے ہی

---

[1] معلم نسواں ص ۹۰، جلد ۱۴، شمارہ ۱۱۔

---

[1] بوستان آصفی جلد دوم ص ۶۸۹

[2] بوستان آصفی جلد دوم ص ۶۸۹

[3] ہماری زبان یکم جنوری ۱۹۶۲ء

افسرالاخبار کے نام سے روزنامہ نکالتے تھے بعد کو انھوں نے ۱۸۹۶ء میں ماہانہ رسالہ نکالا جس کے پہلے ایڈیٹر مشہور صحافی محب حسین تھے۔ اس ضمن میں اکبرالدین صدیقی صاحب نے عابد رضا بیدار کی تردید کی ہے چنانچہ انھوں نے لکھا ہے: "افسر کا پہلا شمارہ ۱۸۹۷ء میں نکلا جس کے سرورق پر ابتدا میں چمڑے کے بلٹ کے ساتھ کرچ کی تصویر ہے جو عام طور پر فوجیوں کی کمر میں لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے نیچے جلی قلم میں رسالہ کا نام سیدھا اور الٹا اس طرح لکھا ہے افسر ا اس کے نیچے ایک سطر میں

جلد (۱) بابت ماہ اپریل ۱۸۹۷ء نمبر (۱)

البتہ ستمبر ۱۸۹۷ء کے پرچے میں جو چھٹا شمارہ ہے افسرالدولہ کی سرپرستی اور ممتاز یار جنگ کے اہتمام کے ساتھ مرتبہ محب حسین لکھا ہے دسمبر ۱۸۹۷ء تک سرورق اسی طرح ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ محب حسین مرحوم نے حیدرآباد سے کئی اخبار یعنی شفیق، معلم، معلم شفیق، معلم نسواں، علم و عمل وغیرہ نکالے۔ مجلّہ افسر بھی انھوں نے جاری کیا جس کا پہلا شمارہ اپریل ۱۸۹۷ء میں انھیں کے مطبع میں انھیں کی ترتیب و اہتمام سے چھپا نہ کہ بابائے اردو نے جاری کیا جیسا کہ اکثر حضرات مثلاً رشید احمد صدیقی، افضل صدیقی اور بیدار صاحب کا خیال ہے ۲۲ دسمبر ۱۹۹۲ء (ہماری زبان) میں جو دوسری قسط "رسالہ افسر" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ محترم اکبرالدین صاحب نے مانک راؤ وٹھل مصنف بستان آصفیہ کے حوالے سے بتایا ہے کہ ۱۸۹۸ء میں بھی یہ نکلتا رہا ۱۸۹۹ء میں کچھ دنوں کے لیے بند رہا۔ ممکن ہے ایک دو شمارے نہ نکلے ہوں پھر بابائے اردو کی ادارت میں نکلنے لگا۔ ۱۹۰۰ء کا مکمل فائل جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں ادارے کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ چوتھی جلد ہے" مولوی اکبرالدین صاحب کا یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہے کہ اپریل ۱۸۹۷ء میں افسر کا پہلا شمارہ شائع ہوا اور ممکن ہے چار چھ شماروں کی اشاعت کے بعد محب حسین کی خدمات اس رسالہ کے لیے حاصل کی گئی ہوں۔ مانک راؤ نے لکھا ہے محب حسین اس ماہنامہ کے دو سال تک ایڈیٹر رہے اس کے بعد مولوی عبدالحق ایڈیٹر ہوئے چنانچہ ان کی ادارت میں بھی یہ پرچہ دو سال تک جاری رہا۔ چنانچہ اکبرالدین صاحب نے بھی لکھا ہے:

> "مولوی عبدالحق صاحب نے افسر کی ادارت ۱۹۰۰ء سے قبول کی لیکن اکتوبر ۱۸۹۹ء سے ان کا تعلق افسر سے ہو گیا تھا۔ نومبر اور دسمبر کے درمیان دو مہینے رسالہ شائع ہوا ہو یا نہ ہوا ہو ان میں کسی شمارے تک رسائی نہ ہو سکی۔"[1]

[1] ہماری زبان ۸ مارچ ۱۹۹۳ء

بہرحال مانک راؤ وٹھل راؤ اور اکبرالدین صدیقی صاحب کی تحقیق اور خود میرے مطالعہ کے بعد یہ ثابت ہے کہ افسر کا پہلا شمارہ اپریل ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا اور چند شماروں کی اشاعت کے بعد ادارت کی ذمہ داری محب حسین کو سونپی گئی۔ چنانچہ وہ ۱۹۰۰ء تک ان فرائض کو انجام دیتے رہے اور جب مولوی عبدالحق ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے حیدرآباد آئے تو تقریباً ۵ سال کے بعد اس رسالہ سے قریب ہوئے اور تقریباً ۲ سال تک یہ پرچہ برابر نکلتا رہا۔

مولوی عبدالحق ہاپڑ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے لیکن بقول زینت ساجدہ صاحبہ جس سرزمین نے انھیں بابائے اردو بنایا وہ حیدرآباد ہے۔ "۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے بی اے کی تکمیل کے بعد حیدرآباد آ گئے جہاں مدرسہ آصفیہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ چند سال بعد معتمدی امور عامہ میں ملازم ہو گئے اور مدتوں مترجم کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں مددگار ناظم تعلیمات کے عہدہ پر فائز ہوئے لیکن بہت جلد صدر مہتمم تعلیمات صوبہ اورنگ آباد کی حیثیت سے تبادلہ ہو گیا۔ وہ بعد میں اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے اور جب ۱۹۳۰ء میں اس عہدہ سے سبکدوش ہوئے تو پہلے ناظم دارالترجمہ اور بعد میں جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر ہوئے تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔" جہاں وہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر کی حیثیت سے آخری زمانے تک کام کرتے رہے۔

مولوی عبدالحق کی شخصیت ہمہ رنگ اور ہمہ مقصد تھی یہی ہے وہ بیک وقت معلم ادب اور محقق زبان بھی تھے، وہ انشاپرداز بھی تھے اور نقاد ادب بھی، اور صحافت کی دنیا میں انھوں نے اپنے جو نقوش چھوڑے ہیں اردو صحافت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تک وہ اورنگ آباد میں مقیم تھے مشہور ادبی رسالہ "اردو" نکالا کرتے تھے جو زبان و بیان کے اعتبار سے منفرد اور مواد کے لحاظ سے گراں قدر تھا۔ مولوی صاحب نے قیام اورنگ آباد ہی کے زمانہ میں انجمن ترقی اردو کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس انجمن کو بہت جلد ریاست بھر میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اصل بات یہ ہے کہ مولوی صاحب نے اردو زبان و ادب کی خدمت کا کام ایسے وقت شروع کیا تھا جبکہ سلطان العلوم اعلیٰحضرت حضور نظام سابع خود بھی اردو زبان و ادب کے عاشق اور شاعر تھے۔ علاوہ ازیں اردو کے لیے فضا سازگار تھی۔ جیسے ہی مولوی عبدالحق صاحب نے اورنگ آباد میں انجمن کی بنا ڈالی حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں اس کو بے حد سراہا گیا۔ مختلف معاصرین نے ادارتی نوٹ اور مضامین شائع کیے چنانچہ معاصر "افادہ" نے مولوی عبدالحق کی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھا۔

[1] حیدرآباد کے ادیب (انتخاب نثر) زینت ساجدہ صفحہ ۱۳۹

"... اردو کے پروان چڑھنے کا سہرا قسمت نے مولانا عبدالحق صاحب بی۔ اے مہتمم مدارس اورنگ آباد دکن وسکریٹری انجمن ترقی اردو کے سر باندھا تھا... بفضل خدا اب انجمن کے پریزیڈنٹ نواب عمادالملک عالی جناب مولوی سید حسین صاحب بلگرامی ہیں۔ انجمن ترقی اردو اس خدمت کے لیے مستعد ہوئی ہے اور ان فولاد کے چنوں کو مصری کی ڈلیوں کی طرح نگل رہی ہے لیکن ابھی "کے دن اور کے راتیں" منزل کوسوں دور اور قدم ابھی سے سست پڑ رہے ہیں۔ لے دے کے ایک اعلیٰحضرت حضور پرنور بادشاہ ملک دکن صانہا اللہ عن الفتن نے انجمن کو اپنے ظل عاطفت میں پناہ دی ہے لیکن رات تھوڑی اور ردنا بہت ہے اردو سارے ہندوستان کی ہے اور تاوقتیکہ جزیرہ نمائے ہند کے ہر گوشے سے امداد نہ ہو اس پودے کا پھلنا پھولنا اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہونا ناممکن ہے۔

بس اگر آپ کے سینہ میں دل اور دل میں درد ہو انجمن ترقی اردو کی مدد فرمائیے اور پوری قوم کے علمی کارناموں کو از سر نو زندہ کیجیے ورنہ یاد رکھیے کہ وقت کا راہوار بگٹٹ نکل جائے گا اور کبھی واپس نہیں آئے گا۔"[1]

اس طرح جب ہر طرف سے انجمن کے قیام اور استحکام کی آواز بلند ہوئی تو بہت جلد یہ کام "افادہ" کی خواہش اور آرزو کے مطابق ہمہ گیر صورت اختیار کر گیا۔ آج اسی انجمن کو ہند و پاک میں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ انجمن کا قیام اور اس کا استحکام مولوی عبدالحق کے اس جذبۂ خلوص کی غمازی کرتا ہے جو اردو زبان کے تعلق سے ان کے دل میں تھا۔ جس طرح اردو زبان پر مولوی صاحب کا احسان عظیم ہے اسی طرح اردو ادب بھی ان کے گراں قدر کارناموں سے سربلند ہے۔ مولوی صاحب چاہے کسی بھی مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہوں، تحقیق کے علاوہ تنقید میں بھی اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ مولوی صاحب کی تنقیدات کے ذکر کے بغیر اردو تنقید کا ارتقا ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ ان کی تحریر میں رنگینی اور سحر نگاری نہیں لیکن وہ سہل نگار بھی نہیں تھے۔ زبان کی سادگی اور بیان کی سلاست ان کی تحریر کا خاصہ ہیں۔ آزاد کی طرح مولوی صاحب کے چند جملے جو انھوں نے کسی بھی شاعر و ادیب کے تعلق سے کہے ہوں اردو تنقید میں بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک تحقیق و تدقیق کا معاملہ ہے دکنی ادب کی بازیافت میں مولوی صاحب نے پہل کی اور ان خزانوں کو ڈھونڈ نکالا ہے جو تاریخ کے ظلمت خانوں میں عرصۂ دراز سے پڑے ہوئے سڑ گل رہے تھے۔ یہ ان ہی کی فیضان عمل اور جذبۂ خدمت کا اثر تھا کہ ڈاکٹر زور جیسی شخصیت پیدا ہوئی جو آگے چل کر عبدالحق کے شروع کیے ہوئے کام کو مستقلاً ایک دبستان کی صورت دے دی۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں مولوی صاحب نے جو عملی نمونے چھوڑے ہیں ان میں سب رس، قطب مشتری، گلشن عشق اور معراج العاشقین کی ترتیب اور ان پر مقدمے ہیں اور ان کے مضامین مقدمات اور خطبات کے مجموعے 'مقدمات عبدالحق'، 'تنقیدات عبدالحق' اور 'چند ہم عصر' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ جہاں تک ان کی مقدمہ نگاری کا تعلق ہے مقدمہ نگاری کو انھوں نے ایک فن بنا دیا اور اس میدان میں کوئی ان کا حریف نہیں ہے۔"

یہاں ان ساری باتوں کے تذکرے سے مولوی عبدالحق کی ادبی شخصیت کا تعین کرنا نہیں کہ مولوی صاحب ہمارے ادب کی ان شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنھیں ان ہی کی عمر میں بزرگی حاصل ہو چکی تھی بلکہ اردو کے عناصر خمسہ کے بعد اگر کوئی اور شخصیت پیدا ہوئی جس نے زبان و ادب کی یکساں طور پر خدمت انجام دی ہے تو وہ مولوی عبدالحق ہی ہیں۔ سرسید عظیم تھے اس وجہ سے کہ انھوں نے بیک وقت علم و ادب کی خدمت کی ہے اور علم و ادب کے ذریعہ قوم میں نئی بیداری کو عام کیا مولوی عبدالحق نے بلاشبہ علی گڑھ تحریک کی طرح کسی بھی تحریک کو جنم نہیں دیا جو اصلاحی اور تعمیری خطوط پر کوئی گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہو لیکن باوجود اس کے انجمن ترقی اردو کا قیام بھی کسی تحریک سے کم نہیں اس کی وجہ سے خود ہندوستان میں اردو زبان و ادب نے قومی اور تعمیری خدمات انجام دی ہیں اور قوم کو اپنے ماضی سے روشناس کرایا ہے وہ بھی ایسا کام نہیں کہ نظر انداز کر دیا جائے۔ مولوی صاحب اور سرسید میں جو قدر مشترک ہے ان کے صحافتی کارنامے ہیں۔ سرسید نے "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ ملک بھر میں صحافت میں نئے رجحانات اور نئے افکار کی بنا ڈالی اور مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو (اورنگ آباد) کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی خدمت کی قیام حیدرآباد کے دوران مولوی صاحب کی ماہ نامہ رسالہ افسر سے وابستگی نے رسالہ کے معیار اور اغراض و مقاصد میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی اور جو رسالہ کل تک صرف فوجی معلومات فراہم کرتا تھا وہ علم و ادب کا نقیب بھی بن گیا۔

مولوی عبدالحق کی رسالہ افسر سے وابستگی سے قبل محب حسین ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بلاشبہ محب حسین کو دکن میں بابائے صحافت کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کی فکر جمیل اور سعی و عمل نے کئی ایک ہفتہ وار اور ماہانہ رسائل کو نئی زندگی اور توانائی بخشی اور حیدرآباد کی اردو صحافت بہت جلد ترقی کے مدارج طے کر گئی تاہم "افسر" کے اغراض و مقاصد میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ آسکی۔ افسر الدولہ کا تعلق افواج آصفی سے تھا اور وہ فوج

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

---

[1] ماہ نامہ 'افادہ' ۱۵ر اپریل ۱۹۱۹ء

مراسلہ

ڈاکٹر گیان چند اور مروّجہ عروض

ڈاکٹر گیان چند کو میں ہمیشہ ایک متوازن عالم اور بالغ نظر مصنف سمجھتا رہا۔ ان کی تحقیقات میں ایک علمی معیار ہوتا تھا جس کی میں بڑی قدر کرتا تھا۔ لیکن ۲۲ر اگست ۷۶ء کے ہماری زبان میں عروض پر ان کا ایک مضمون دیکھ کر مجبوراً مجھے یہ کہنا پڑا ؎

گلشن میں بھی باقی نہیں تسکین کا ساماں
آوازِ زغن گونجتی ہے صحنِ چمن میں

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں ڈاکٹر صاحب کے عروضی نظریے صحیح ہوں یا غلط لیکن کم سے کم تہذیب بیان باقی ہے۔ سبب اس کا شاید یہ ہو کہ مخاطبوں میں دو ایک عروضی بھی ہیں جن سے ترکی بہ ترکی جواب ملنے کا اندیشہ تھا۔ لیکن مضمون کے دوسرے حصے میں تو جیسے وہ کھل کھیلے ہیں۔ علمی معیاروں کی تکذیب، عطائیوں کے نکتۂ نظر کی تائید، محقق طوسی علیہ الرحمہ، خاقانی، شیخ علی حزیں اور میر پر چھچھوری پھبتیاں اور فقرے بازی۔ یہ ہیں اس حصۂ مضمون کی خصوصیتیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک عالم کا ذہن اس پست سطح پر کیونکر پہنچ گیا۔

میں ذاتی وجوہ کی بنا پر اس مضمون کے پہلے حصے کے متعلق کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ میری یہ مختصر تحریر صرف مضمون کے دوسرے حصے سے متعلق ہے۔

اتفاق سے میں بھی اُن لوگوں میں ہوں جو اردو شاعری کے لیے اتباعِ عروض کو لازمی اور ضروری سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اصولِ فن ہی سے اخذ کیے جاتے ہیں لیکن ان کے منضبط ہو جانے کے بعد خود فن تابعِ اصول ہو جاتا ہے۔ اصولِ فن کا معیار ہیں۔ مدتوں کی جانچ پرتال کے بعد چونکہ وہ اربابِ دانش کی تائید حاصل کر لیتے ہیں لہٰذا کسی اکیلے فرد کی رائے کو اصول پر ترجیح نہیں دی جا سکتی لیکن ساتھ ہی توسیعِ اصول کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے بشرطیکہ نئے خیال کو ایک ضابطے کی صورت میں پیش کیا جائے اور رد و قدح کے بعد اربابِ دانش اُسے مان لیں۔ سُر گانے نے پہلے لیکن اب گانا سُر کے تابع ہے۔ تال رقص ہی سے اخذ ہوئی لیکن اب رقص تال کا پابند ہے۔ اسی طرح عروض کلامِ موزوں ہی سے پیدا ہوا لیکن اب موزونیت عروض کی زیرِ نگرانی ہے۔

جب تک بحورِ عروضی میں شعر کہا جائے گا عروض کی پابندی اصولاً لازمی ہوگی۔ لیکن اگر شاعر گیت لکھے جس کا تعلق لے اور تال سے ہے تو عروض دخل اندازی نہیں کرے گا۔ ہاں اگر شاعر ہندی بحور میں شعر کہنا چاہتا ہے وہ ضرور کہے۔ لیکن پہلے کہہ دے کہ یہ فلاں ہندی بحر ہے تاکہ اس مخصوص بحر کے قواعد پر اس کے کلام کو جانچا جا سکے متقارب اپنی جگہ موزوں ہے اور سویا اپنی جگہ موزوں ہے۔ کسی بکے ہوئے شاعر کی سند پر متقارب میں سویا کو دخل نہیں کیا جا سکتا۔ متقارب اوزان کی بحر ہے۔ سویا ماتروں کی بحر ہے۔ بادی النظر میں یہ دونوں قریب معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کی چال الگ ہے۔ متقارب کے رد کیے ہوئے مصرعے نہ سویا میں آ سکتے ہیں نہ سویا کے غلط مصرعے متقارب کے سر تھوپے جا سکتے ہیں۔ پھر سویا چھند بھی کوئی حلوہ نہیں جسے اٹھا کر کھا لیجیے۔ وہاں بھی اچھے اچھے غوطہ کھا جاتے ہیں۔

پرانے صوفیوں نے ہندی بحور میں جو کچھ کہا ہے اس میں سے بیشتر پنگل شاستر کی رو سے درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقدس بزرگ دراصل شاعری کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مقصد نغمے اور عام پسند لے میں اپنے خیالات زندگی کی الجھنوں میں پھنسے ہوئے مصیبت زدہ انسانوں تک پہنچا کر ان کی تسکین منظور کرنا تھا۔ چھندوں کے متعلق ان میں سے بیشتر حضرات کی معلومات بھی اوسط سطحی تھیں۔ چھندوں کو علمی سطح پر برتنے میں وہی مشکلات سامنے آتی ہیں جو عروض میں ہیں۔

اس کے علاوہ سوائے اُن چند بحور کے جو برج، اودھی یا شمالی ہند کی دوسری بولیوں میں رائج تھیں (جیسے دوہا، سورٹھا، چوپائی، کبت، سویا وغیرہ) باقی بیشتر ہندی بحور اردو کے معیار کے مطابق ناموزوں ہیں۔ علی الخصوص ہندی کھڑی بولی کے شاعر جن بحور میں شاعری کرتے ہیں وہ تو یک لخت ناموزوں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے یہ سب سنسکرت کی نامانوس بحریں ہیں جن کا عوام سے کبھی تمسک اور تعلق نہیں رہا۔ یہ ساری بحریں شاستریوں کے ذہن کی اختراعات ہیں جن کو صرف شاستری ہی برتتے رہے۔ سنسکرت کی سب سے دلکش بحر انشٹب چھند جس میں ہندوستان کی مقبول ترین سنسکرت کی کتاب گیتا ہے اردو والوں کے لیے بالخصوص اور شمالی ہند والوں کے لیے بالعموم نثر کے برابر ہے۔ اس سے میرا مطلب نہیں کہ سنسکرت بحور ناقص ہیں۔ ان بحروں میں موزونیت کا اعلیٰ شعور ہے لیکن عربی کی متروکہ بحروں کی طرح ناموزوں ہمارے لیے یہ بحریں موزوں نہیں۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے تک ہمارے یہاں ایسے عروضی تھے جن کا جواب روئے زمین پر نہ تھا۔ اب اس علم کے جاننے والوں کا قحط ہے۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند اگر چھینٹے بازی اور علمائے عظام کی شان میں سوئے ادب کی بجائے عروض پر کوئی اصولی بحث علمی انداز میں چھیڑیں تو ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں جو انھیں پوری طرح مطمئن کر سکتے ہیں۔

شیخ علی حزیں اتنے جید عالم اور استاد تھے کہ غالب اور سودا بھی ان کے آگے سرِ عقیدت جھکاتے ہیں لیکن ڈاکٹر گیان چند ان پر یہ تہمت لگا رہے ہیں کہ بحر مقتضب میں انھوں نے مفعولن کی جگہ مفتعلان اور مفتعلن اپنی طرف سے ٹھونس دیا ہے۔ حالانکہ ان سے مدتوں پہلے معیاری اشعار میں بحر مقتضب

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

جن سنگھ کسی قیمت پر اردو کو دوسری سرکاری زبان نہ بننے دے گی

لکھنؤ۔ آل انڈیا جن سنگھ کے دو سرکردہ لیڈروں بلراج مدھوک اور ناناجی دیش مکھ نے کل یہاں ایک پریس کانفرنس میں ایک بار پھر وضاحت کی کہ جن سنگھ اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان نہیں بننے دے گی اور اگر ایسا کیا گیا تو جن سنگھ مخلوط حکومت سے علیحدگی اختیار کرے گی۔

ان لیڈروں نے کہا کہ جن سنگھ ہندی اردو کے مسئلہ پر پوری طرح متحد ہے۔ اردو کو ایک زبان کی حیثیت سے سہولتیں تو ضرور دی جا سکتی ہیں مگر اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی حکومت نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ اردو میں گزٹ کی اشاعت ہوگی لیکن ابھی حال ہی میں سرکاری طور پر جو اعلانیہ جاری کیا گیا ہے ہم اس کی چھان بین کریں گے کہ آخر یہ اعلانیہ کیوں جاری کیا گیا۔

جن سنگھ کے سکریٹری جنرل ناناجی دیش مکھ نے بتایا کہ جن سنگھ نے نائب وزیر اعلیٰ جناب رام پرکاش کے ذریعہ اس سرکاری اعلانیہ کی جانچ کرنے کا مطالبہ کیا ہے کہ حکومت میں شامل دوسری جماعتوں کے علم و اطلاع کے بغیر اس قسم کا اعلانیہ کیسے جاری کر دیا گیا اور اردو کو سہولتیں دینے کا اعلان کیوں کیا گیا۔ بلراج مدھوک نے کہا کہ جن سنگھ اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہے۔ ہماری مرکزی مجلس عاملہ نے اردو میں گزٹ کی اشاعت کی مخالفت کی ہے البتہ گزٹ کا خلاصہ اردو میں شائع کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

(ریاست جدید کانپور)

اردو، ہندی کی حریف نہیں بلکہ اس کی بہن ہے

گوالیار میں انجمن ترقی اردو کا جلسہ

گوالیار۔ انجمن ترقی اردو کا ایک جلسہ کملا راجہ گرلس کالج کی "لیکچر گیلری" میں منعقد ہوا جس کی صدارت پنڈت آنند بہاری مشرا نے کی۔

انجمن کے جنرل سکریٹری وقار صدیقی نے پنجاب اور کشمیر کے سابق ممبر پارلیمنٹ جناب ویریندر کمار ستیہ وادی اور جناب مولانا عبد الرحمٰن کا تعارف پیش کرتے ہوئے انجمن کی جانب سے دونوں حضرات کا خیر مقدم کیا اور پنڈت سندر لال کی علالت کی بنا پر اس جلسے میں شرکت نہ کرنے پر اظہار افسوس کیا۔

پنجاب کے سابق ممبر پارلیمنٹ اور "ویر بھارت" کے ایڈیٹر جناب ویریندر کمار ستیہ وادی نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ کوئی زبان کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی، ہر زبان اپنی طاقت کی بنا پر نشو و نما پاتی ہے اور اردو زبان میں وہ طاقت موجود ہے اس لیے ہمیں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہندی رسم الخط میں اردو ادب بہت مقبول ہو رہا ہے اور اس طرح اردو کی اشاعت و ترقی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

آپ نے اردو والوں کو سیاست دانوں سے خبردار رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا، کانگریس نے اپنے بیس سالہ دورِ حکومت میں اردو کو اس کے جائز مقام سے محروم رکھا اور آج وہی لوگ اردو کا جھنڈا بلند کر کے اکثر ریاستوں میں غریب اور معصوم عوام کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔

ڈاکٹر ویریندر کمار شرما نے کہا گو ملک سیاسی طور سے آزاد ہو چکا ہے، لیکن ہم ذہنی طور سے ابتک غلام ہیں۔ آپ نے کہا کسی زبان کے رسم الخط کو تبدیل کرنے کا مشورہ دینا اس کی انفرادیت کو ختم کرنا ہے، اردو زبان کو اس کے اپنے رسم الخط کے ساتھ ترقی کے پورے مواقع فراہم ہونے چاہئیں۔

ڈاکٹر صاحب نے آگے چل کر کہا، اردو اس ملک کی زبان ہے اس نے قومی آزادی کے ہر موقع پر بہار اساتھ دیا اور سماجی اور قومی ضرورتوں کو پورا کیا، جنگ آزادی کے دوران اردو نے ہمیں "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ دیا، جس نے انگریزی سامراج کو ہندوستان سے نکال باہر کیا۔

کشمیر کے سابق ممبر پارلیمنٹ مولانا عبد الرحمٰن صاحب نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا، "ہندوستان ایک عظیم ملک ہے" اس کی وحدت اس کی کثرت میں موجود ہے، اس ملک میں مختلف مذاہب، عقیدے اور فرقوں کے ماننے والے رہتے ہیں، مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، اگر کسی مذہب، عقیدے اور زبان کو ختم کرنے کے بارے میں سوچا جائے تو وہ بڑی حماقت ہوگی۔

مولانا صاحب نے ہندی اور اردو کے رشتے کا ذکر کرتے ہوئے کہا اردو ہندی کی حریف نہیں بلکہ اس کی بہن ہے۔ آپ نے اپنا سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا، زبانیں رفتہ رفتہ بنتی ہیں، ضروریات کے لحاظ سے الفاظ کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہے لیکن وہی الفاظ جو روزمرہ استعمال ہوتے ہیں اور عوام جن سے مانوس ہوتے ہیں "عوامی زبان" کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اردو اور ہندی دونوں کو آسان اور عام فہم بنانے کی ضرورت ہے اب ہی وہ ہماری ضرورتوں کو پورا کر سکیں گی۔ اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کو سائنٹیفک طریقوں سے سکھایا جائے۔

آپ نے آخر میں کہا انجمن ترقی اردو کو چند لوگوں تک محدود نہ ہونے دیجیے بلکہ اسے عوامی انجمن بنایئے۔ آج ہماری آواز کمزور ہے اگر اس کے پیچھے عوامی طاقت ہوگی تو کوئی حکومت اس کا جائز مقام دینے سے انکار نہیں کر سکتی اور تب ہی اردو کو اس کا آئینی درجہ حاصل ہو سکے گا۔

صدر جلسہ جناب آنند بہاری مشرا نے کہا اردو ہندوستان

میں پیدا ہوئی ہے اور ہندوستان میں قائم رہے گی، جو لوگ اردو زبان کو مٹانے کے بارے میں سوچتے ہیں ان میں کوئی کمی ضرور ہے۔

صدر جلسہ نے باہر سے آئے ہوئے مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا۔

اس موقع پر گڑا لیار کے نامور شعراء جناب گلشن تلوانی، جناب نثار پردیزی، جناب وقار صدیقی، جناب سعید گوالیاری، حضرت فیاض گوالیاری، حضرت ریاض انصاری نے اپنا کلام پیش کیا جسے حد پسند کیا گیا۔

(وقار صدیقی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ گوالیار)

شجاعت علی سندیلوی انجمن ترقی اردو سے سبکدوش

لکھنؤ: انجمن ترقی اردو لکھنؤ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے عارضی طور پر اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کرلی ہے۔

انھوں نے ایک بیان میں بتایا ہے کہ اپنی والدہ کی شدید اور خطرناک علالت کی وجہ سے میں انجمن اور دوسرے اداروں کی ذمہ داریاں ادا کرنے سے قاصر ہوں اس لیے انجمن اور اس کے دفتر سے متعلق جملہ امور اب ڈاکٹر محمد لطیف خاں اور تنظیمی و تعلیمی امور گیانی جیتندر سنگھ اور ضیاء الحسن صدیقی انجام دیں گے۔

(قومی آواز، لکھنؤ)

وشال ہریانہ اور اردو

مظفر نگر: مظفر نگر میں عظیم تر ہریانہ تحریک کا آغاز ایک جلسۂ عام سے کیا گیا۔

ٹھاکر یشپال سنگھ اور یوپی کے وزیر جنگلات رام چندر وکل نے بھی عظیم تر ہریانہ تحریک کے اس جلسہ میں شرکت کی۔ ٹھاکر یشپال سنگھ نے کہا کہ ہم ایسا صوبہ بنانا چاہتے ہیں جہاں پر اردو کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ اگر ہندی کے بعد کسی زبان کو ثانوی درجہ دیا جا سکتا ہے تو وہ زبان اردو ہے کیونکہ اردو ہمارے صوبہ کے کثیر تعداد لوگ بولتے ہیں اور ثانوی زبان بنانے میں کوئی دقت بھی نہیں ہوگی۔　　(الجمعیۃ دہلی)

یوپی دو زبانوں کی ریاست نہیں بن سکتی

لکھنؤ: یوپی کانگریس کے صدر کملاپتی ترپاٹھی نے کل یہاں اخباری نمائندوں کو بتایا کہ یوپی دو زبانوں کی ریاست نہیں بن سکتی۔ انھوں نے کہا کہ ہندی کو آئین میں قومی زبان قرار دیا گیا ہے اور یہ قومی زبان ہے جہاں تک دوسری زبانوں کی پڑھائی کا تعلق ہے جہاں تک قابل عمل ہو اس کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں۔　　(ریاست)

دیویندر ستیارتھی کے ساتھ ایک شام

۸ اکتوبر کو شب میں ایک ادبی نشست دیویندر ستیارتھی کے اعزاز میں حلقۂ ادب کی جانب سے منعقد کی گئی تھی۔

نشست کی صدارت اردو کے پُرگو کہنہ مشق شاعر جناب لطیف محمد لطیف نے فرمائی اور ناظم کے فرائض خلیل تنویر نے انجام دیئے۔ نشست کی کارروائی شروع کرتے ہوئے خلیل تنویر نے دیویندر ستیارتھی کا تعارف حاضرین سے کرایا۔ اس کے بعد ہندی شاعر اور ساہتیہ اکیڈمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر پرکاش نے ستیارتھی جی کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ "ستیارتھی جی نے گاؤں، گاؤں، شہروں، شہروں گھوم کر لوک گیت جمع کئے اور عوام کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور رنگوں سے ادبی حلقہ کو روشناس کرایا۔"

اس کے بعد ایک شعری نشست ہوئی جس میں بھگوتی لال دیاس، حفیظ الایمان، دجے کلشریشٹھ، مشتاق احمد مشتاق، لطیف اردو پوری، ادنکار پارکھ، شاہد عزیز، عابد جمیل ادیب اور برق اردو پوری نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔

اس کے بعد ستیارتھی جی سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی کہانی سنائیں۔ ستیارتھی جی نے پہلے اپنی ادبی زندگی کے کچھ اہم اور دلچسپ واقعات بیان کئے اور اپنی تازہ کہانی "......" سنائی .... پر کئی سوالات کئے گئے اور خوشگوار ماحول میں بحث بھی چلی۔

نشست کا اختتام صدر جناب لطیف محمد لطیف کی غزل سے ہوا۔　　(نامہ نگار)

کیرالا میں اردو طلبہ کی انجمن کا افتتاح

گورنمنٹ ہائی اسکول ملاپرم (کیرالا) کے اردو طلبہ ایسوسی ایشن کے سال رواں کی افتتاحی رسم حال ہی میں محترم جناب ایچ۔ ایم۔ اے۔ شکور صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی میسوری نے انجام دی۔ آپ نے اردو کی ہمہ گیری و مقبولیت عامہ پر روشنی ڈالتے ہوئے بچوں کو یہ زبان سیکھنے کی رغبت دلائی۔ جلسہ جناب ایس۔ ایم۔ سرور صاحب کے زیر صدارت منعقد ہوا اور ساڑھے پانچ بجے اردو کے رنگارنگ پروگرام کے بعد ختم ہوا۔

(وی حمزہ سکریٹری)

ہماری زبان

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

صفحہ ۸ سے آگے

حصول حرب اور سپاہیوں کے کارناموں میں دلچسپی رکھتے تھے اس وجہ سے اگر انھوں نے "افسر" کو محض فوجی ترجمان بنا دیا تھا تو اس میں تعجب بھی نہیں بلکہ اس رسالہ کی بڑی حد تک یہ انفرادیت تھی اور اپنی نوعیت کا ملک بھر میں واحد فوجی رسالہ تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس رسالہ کی یہ انفرادیت اس کی مقبولیت میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی تھی چنانچہ مولوی عبدالحق نے جب اس رسالہ کی ادارت کا کام اپنے ذمہ لیا تو انھوں نے اس تخصیص کو ختم کر دیا اور اب "افسر" صرف فوجی ہی نہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ ادبی و معلوماتی رسالہ بھی بن گیا۔

"افسر" کی پوری جلدیں نایاب ہیں اور جیسا کہ محترم اکبرالدین صاحب صدیقی نے لکھا ہے اس کی چوتھی جلد ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔ اس جلد کا مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے ملک بھر کے تمام نامور ادیبوں اور شاعروں سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی چنانچہ اس کے لکھنے والوں کی فہرست میں حقائق آگاہ سید بے نظیر شاہ قادری چشتی، نواب عماد الملک، محب حسین، ظفر علی خان، عزیز مرزا اور دیگر مشہور اہل قلم شامل ہیں۔ حیدرآبادی اردو رسائل کی روایت کے مطابق "افسر" میں چھپنے والے بہترین مضمون یا نظم پر بھی مصنف کو ایک اشرفی نذر کی جاتی تھی۔ اردو ناول پر ایک نظر غالباً اپنی نوعیت کا پہلا تنقیدی مضمون ہے جس میں عزیز مرزا نے ناول پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ سگنلنگ جیسے موضوعات پر معلوماتی مضامین بھی اس میں شامل ہوا کرتے تھے۔ اشرف المخلوقات اب مردوں کی ضرورت نہیں، چلتے ہوئے پتہ کے حیوان پر ہلکے پھلکے طنزیہ مضامین اس رسالہ کے معیار کو بڑھانے کے لیے کافی تھے۔

حیدرآباد کے دیگر ادبی رسائل کی طرح یہ رسالہ بھی زیادہ دنوں تک پنپ نہیں سکا اور چار ساڑھے چار سال تک وقفہ کے ساتھ شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ ان چار ساڑھے چار سالوں کے اندر ابتدائی چار چھ ماہ خود افسر الدولہ نے نگرانی کی بعد کو دو سال کو محب حسین نے ادارت کے فرائض انجام دئے اور آخر کے دو سال مولوی عبدالحق نے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ادبی نقطہ نظر سے مولوی عبدالحق کا زمانہ ادارت افسر کو غیر معمولی اہمیت دلاتا ہے۔

صفحہ ۹ سے آگے

کے ضمن میں خود محقق طوسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مقتضب کی مذال (یعنی مفتعلان) اور مجری (یعنی مفتعلن) مثل دوسرے اوزان کے روا ہیں۔ (زر کامل عیار صفحہ ۳۰)

محقق طوسی علیہ الرحمہ بالاتفاق دنیائے اسلام کے صف اول کے چند منتخب عالموں میں شمار ہوتے ہیں۔ علوم و فنون پر ان کی گوناگوں وحید عصر تصنیفات میں سے ایک چھوٹی سی تصنیف معیار الاشعار بھی ہے۔ خدا کی شان کہ ڈاکٹر گیان چند فن عروض کی اس ام الصحف کا مذاق اڑائیں اور اس کے مصنف کے فیصلے پر آزاد نظم کی پھبتی کسیں۔

محقق علیہ الرحمہ بحر متقارب مثمن سالم کے رکن آخر فعولن کو مقصور (فعول)، محذوف (فعل) اور ابتر (فع) کرنے کا اصولی فیصلہ دیتے ہوئے مثال میں چند عربی اشعار پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان عربی اشعار کی مثالوں پر خفا ہیں اور محقق کے فیصلے کو آزاد نظم کا مترادف قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ زحافات اور ان کے بنیادی اصول سمجھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں متقارب میں یہ زحافات اصولاً جائز ہیں اور شاعر اس کا فائدہ پہلے مصرع کے سالم الارکان ہونے کے باوجود اٹھا سکتا ہے۔ اصول کے تحت اس قسم کی آزادی کئی بحروں میں پیدا ہوتی ہے۔ خصوصاً رباعی میں تو آپ مختلف تقطیع کے چوبیس اوزان چار مصرعوں میں استعمال ہوتے ہیں میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب شاید رباعی کو آزاد نظم ہی قرار دیں گے۔

پرانے فارسی شاعروں کے زمانے میں عروض پوری طرح چوکس نہ تھا۔ لہٰذا رودکی نے ایک جگہ متقارب مثمن کے پانچویں رکن کو فعولن سے فعل کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خفا ہیں کہ اس دھاندلی کو محقق نے جائز قرار دیدیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ خود محقق نے فرمایا ہے کہ فعلم (یعنی فعلن) دوسرے مصرع کے شروع میں متقدمین نے استعمال کیا ہے لیکن متاخرین اسے متروک سمجھتے ہیں (صفحہ ۴۲ زر کامل عیار) شعرائے متقدمین کی مثال میں محقق نے رودکی کا وہی شعر نقل کیا ہے جسے ڈاکٹر صاحب پیش کر رہے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ عروض کا پیغمبر دہ نقص خود ان کی تلاش اور [illegible] تجربہ نہیں ہے [illegible] دوسرے دیدہ دانستہ محقق کے اس فیصلے کو چھپا کر عروض کے متعلق کچھ اپنی بات کہنا چاہتے ہیں۔

بحر مضارع میں ایک شعر جادو وزن آتا ہے جسے شہنشاہ ترنم خاقانی نے نظم کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خاقانی پر ترنم ناشناس ہونے کا الزام لگاتے ہوئے کس بے باکی سے فرماتے ہیں کہ خاقانی نے وزن کی مٹی پلید کی ہے۔ اگر کسی کا شعور دادرے سے آگے نہیں بڑھتا تو جھپ تال بے تالی نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر صاحب کے عروض پر اعتراض ذرا بھی تحقیقی نہیں ہیں، یہ وہی پیش افتادہ باتیں ہیں جو عروض سے متعلق مختلف مضامین اور رائج عروضی کتابوں میں دوسرے کہہ گئے ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کا مداحی فرمودہ کہ عروض کے حامی کنویں کے مینڈک ہوشیار ہو جاؤ۔ وقت اور شاعری آگے بڑھ رہی ہے تم معیار الاشعار کو پکڑے ہوئے کب تک بیٹھے رہو گے وغیرہ وغیرہ عجب باتیں جدیدیت والوں کے مضامین میں پڑھ پڑھ کر سر دکھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی ضروری ہے کہ اس موضوع پر بیان کا کوئی تشریح مضمون آ رہا ہے جس خدا بچائے اس مضمون سے۔

جس حسن کا اب یہ عالم ہے ہیں عشق کے مر جانے کیا ہوگا
(صفدر آہ)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) [illegible] پرنٹر [illegible] نے [illegible] پریس [illegible] سے چھپوا کر اور
پبلشر [illegible] نے دفتر [illegible] انجمن ترقی اردو (ہند) [illegible] سے شائع کیا۔